ڈاکٹر مشتاق عادل
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو،دی یونیورسٹی آف لاہور، پاکپتن کیمپس
اللہ یار ثاقب
پی ایچ ڈی سکالر، اردو،لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

پاکستانی پسماندہ طبقے کے مسائل اور ناول"میرا گاؤں"

Problems of lower class in Pakistan an the Novel "Mera Ghayoo"

Ghulam Ul Saqlain Naqvi is a famous Novelist. His unique writing style mad his work more interesting, earning him an ever-lasting position in Urdu literature. His novels especially "Maira Gaon" show the reality of society. In this article the problems of lower society in Pakistan are discussed. The novel shows that how a Land Lord treats with poor farmer and his worker.

Key words: Famous, Novelist, Reality, Society.

غلام الثقلین نقوی کا ناول میرا گاؤں دیہی زندگی کے مسائل مشکلات اور سیاسی و سماجی حالات کا عکاس ہے۔ناول نگار نے دیہی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہاں کے مکینوں کی مشکلات کو احاطہ تحریر میں لا کر ایک منفرد ناول کی صورت میں اردو ادب کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔میرا گاؤں کے کردار وہ غریب مزدور اور چھوٹے کاشتکار ہیں جنھیں نہ صحت کی سہولتیں میسر ہیں اور نہ تعلیم کی۔میرا گاؤں کی کہانی آٹے پیسنے کی چکی سے شروع ہوتی ہے جو ظاہری طور پر تو خراس کا متبادل ہے مگر اس مشین کی آمد سے ایک ثقافت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ چوہدری شرف دین نے گاؤں میں آٹا پیسنے کی چکی لگا کر گاؤں والوں کو یہ سہولت میسر کر دی کہ کم وقت میں زیادہ آٹا پس جاتا۔اس عمل سے چوہدری کی آمدنی میں تو اضافہ ہوتا گیا مگر بابا نتھو جو گاؤں میں اپنی پوتی شیماں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔اس کا خراس بند ہو گیا۔اسی طرح سُلی اور ماہنا دو ایسے کردار ہیں جو دو مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک طبقہ جاگیر دار ہے اور سفید پوشی کے نام پر غریب عوام کا استحصال کرتا ہے تو دوسرا طبقہ غریب ہے۔اس سماج میں اگر غریب کا بیٹا پڑھ جاتا ہے تو بھی اُسے روزگار کے حصول کے لیے امیر کے دروازے پر دستک دینا پڑتی ہے اور کوئی بھی امیر آدمی نہیں چاہتا کہ غریب کا بچہ پڑھ کر نوکری حاصل کرے اور امیروں کے ہم پلہ ہو جائے۔ناول نگار

نے بہت خوبصورت انداز میں دیہی معاشرے کی منظر کشی کرتے ہوئے پنچائتی سسٹم، غریب لوگوں سے ہونے والے سلوک اور طاقت کے قانون کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ اس سماج میں اگر کوئی امیر آدمی غریب کی عزت لوٹتا ہے تو اس پر کوئی حرف نہیں آتا مگر وہی جرم جب غریب کرتا ہے تو اس کے لیے طرح طرح کی سزائیں تجویز ہوتی ہیں۔ گاؤں کے چودھری اور نمبر دار پولیس کے ٹاؤٹ ہوتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں اسے جیل بھجوا دیتے ہیں۔ بلاشبہ ایک گاؤں کی کہانی ہے مگر حقیقت میں یہ پورے ملک کی عکاسی ہے کیوں کہ اس ملک کے غریبوں کو کہیں سندھ کے جاگیر داروں کے ظلم کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کہیں انھیں بلوچستان، سرحد اور قبائلی علاقے کے سرداروں کے ہاتھوں ہونے والے جور و ستم سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح پنجاب کا وڈیرہ، خان اور چودھری بھی غریب لوگوں کے استحصال کرنے میں برابر کا حصہ دار ہے۔

ناول نگار نے بہت خوب صورت انداز میں اس تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے کہ بلاشبہ سائنسی ایجادات نے انسانی زندگی پر بہت اثرات مرتب کیے ہیں اور آسائشوں میں اضافہ کیا ہے مگر مشینوں کی ایجاد سے بہت سے مزدوروں کا روزگار چھن گیا ہے۔ ایسی تبدیلی گاؤں میں اس وقت وقوع پذیر ہوتی ہے جب چودھری گاؤں میں آٹا پیسنے والی چکی لگالیتا ہے تو نتھو خراسیے کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔ ماہنا جب چکی پر گندم پسوانے کے لیے جاتا ہے تو چودھری کی بیٹی اس سے کہتی ہے:

> "میں نے پوچھا 'حمیداں! آٹا جل تو نہیں گیا؟۔۔۔ نہیں ماہنے! نتھو خراسیے کی باتوں میں نہ آنا۔ آٹا نہیں جلا۔ اس کی قسمت جل گئی ہے۔۔۔ ایسا نہ کہو حمیداں۔ کیوں نہ کہوں؟ وہ ہم سے جلتا ہے۔ جب سے ہماری چکی لگی ہے، وہ بری بری باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے چوہدری نے ہم کمین کمینوں کے منہ سے لقمہ چھین لیا ہے۔ یہ ہمارے باپ دادا کا کسب تھا۔ چوہدری تو جاٹ کا بیٹا ہے۔ اسے یہ کسب شوبھا نہیں دیتا۔ دیکھو ماہنے تم شیماں کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔"(۱)

قیام پاکستان سے لے کر اب تک غریبوں کی حالت بدلنے کے نعرے تو بہت لگے، غریبوں کے ہمدرد ہونے کے دعوے دار تو کئی نظر آئے مگر عملی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جاگیر دار، نمبر دار اور سفید پوش صرف اسی وقت غریب لوگوں کو منہ لگاتے ہیں جب اپنا مفاد ان سے وابستہ ہوتا ہے۔ عبدالرحمن عرف ماہنے کے والد موج دین نے جب قران پاک پڑھانے کے بعد اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ کاشتکاری پر لگانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک دن گاؤں

کا نمبر دار اور سفید پوش چودھری شرف ان کے گھر آیا اور موج دین کو کہنے لگا کہ اپنے بیٹے کو حصولِ تعلیم کے لیے تین میل کے فاصلے پر واقع گاؤں گل بہار کے سکول بھیجے۔ اصل میں اسے مسئلہ یہ پیش آیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سلیمان عرف سُلّی کو سکول میں داخل کروا چکا تھا لیکن سلیمان کا اکیلے اتنا دور جانا مناسب نہ تھا۔ اس لیے اس نے موج دین کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ ماہنے کو بھی سکول بھیجے۔ جب موج دین نے کہا کہ یہ میرے ساتھ کاشتکاری میں میرا ہاتھ بٹائے گا۔ اس نے کون سا پڑھ کر پٹواری لگ جانا ہے تو چودھری شرف نے وعدہ کیا اور کہا کہ میرا تیرا خدا ضامن ہے میں اسے ضرور پٹواری لگوادوں گا۔ مگر جب اس کے باوجود مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آیا تو اس نے تین ایکڑ زمین جو موج دین کو دے رکھی تھی اگلے سال کسی اور کو دینے کی دھمکی دے ڈالی۔ ساتھ بیٹھے مولوی نے صورتحال کو سنبھالتے ہوئے چودھری کو کہا کہ کل سے ماہنا سکول پہنچ جائے گا اور پھر مجبوراً موج دین کو بھی اقرار کرنا پڑتا ہے۔ جب ماہنا اور سلی پرائمری پاس کر گئے تو ماہنے کے والد نے یہ کہہ کر اپنے بیٹے کو سکول جانے سے روک دیا کہ اب سلی بڑا ہو چکا ہے اور اسے تیری مدد کی ضرورت نہیں اور ویسے بھی اگر تم پڑھ لکھ گئے تو چودھری نے کونسا تجھے پٹواری لگوا دینا ہے۔ ماہنے نے یاد دلایا کہ اس نے وعدہ کر رکھا ہے۔ موج دین نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے جو بات کی وہ صرف نمبر دار، سفید پوش چودھری شرف دین کی بات نہیں بلکہ اس سماج کے ہر چودھری کی بات ہے:

> "وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا۔ میں چوہدری کی رگ رگ کو جانتا ہوں۔ ماہنے! وہ اپنے شریک کو پٹواری کیوں بننے دے گا۔ تیری روزی کتاب میں نہیں ماہنے! اس مٹّی میں ہے جس سے تیرے باپ دادا اپنی روٹی کا بندوبست کرتے رہے۔ چل کام شروع کر دے۔ میں نے ترنگل کو اٹھانا چاہا تو وہ لوہے کی لاٹ بن گیا۔ کیا میرے بازو شل ہو گئے ہیں؟ نہیں۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ میں نہیں جانتا۔ بابا نتھو نے سچ کہا تھا۔ سریر بڑا کائیاں ہوتا ہے۔ میرا سریر مجھ سے باغی ہو گیا تھا۔"(۲)

ناول نگار نے گاؤں کے نمبر دار اور سفید پوش چوہدری شرف دین کے رویوں سے اس دیس کے ان تمام چودھریوں، ملکوں اور خانوں کے خیالات کی ترجمانی کی ہے جو بظاہر غریبوں کے ہمدرد ہوتے ہیں مگر جس طرح وہ اپنے اور کاشتکار کے درمیان ایک حد فاصل رکھنے کے قائل ہوتے ہیں اسی طرح کی سوچ اپنی اولاد کے لیے بھی رکھتے ہیں۔ ان نام نہاد سرپرستوں اور بہی خواہوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ غریب ان کی ہر جائز و ناجائز بات کی تائید کریں، ہر حکم مانیں اور ان کی ہر سزا کو خوش دلی سے قبول کریں اسی طرح ان کی یہ بھی سوچ ہوتی ہے کہ ان کے بچے

غریب کے بچوں کو ماریں، سزادیں یا زیادتی کریں تو غریبوں، مزارعوں اور چھوٹے کاشتکاروں کے بچے چپ چاپ یہ سب کچھ برداشت کریں کیوں کہ اس طرح ان کے بچوں کو چودھراہٹ کرنے کی مشق ہو جاتی جب کہ غریبوں کے بچے ظلم سہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

بچہ خواہ امیر کا ہو یا غریب کا، کارخانہ دار کا یا مزدور کا، مالک کا ہو یا مزارع کا، بڑے زمیندار کا ہو یا چھوٹے کا وہ بچہ ہوتا ہے اور تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر برابری کی سطح پر تعلقات قائم رکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کی سوچ ابھی نفع و نقصان سے عاری ہوتی ہے۔ جب ماہنا اور سُلی سکول سے واپسی پر ایک دن شیما کے ذکر پر ایک دوسرے سے باتوں باتوں میں الجھ پڑے تو نمبردار کے بیٹے سُلی نے کاشتکار کے بیٹے ماہنے کو گالی دی اور تھپڑ دے مارا اور جب ماہنے نے جواباً سلی کی پٹائی کی تو چودھری شرف دین اپنے بیٹے کو سمجھانے اور حالات و واقعات کو جانے بغیر ماہنے کے باپ موج دین کے گھر جا دھمکا۔ اپنے بیٹے کی وکالت کرتے ہوئے ماہنے کو موردِ الزام ٹھہرانے لگا حالاں کہ قصور اس کے اپنے بیٹے کا تھا جس نے پہل کی تھی۔ بات یہیں پر ختم نہ ہوئی بل کہ جاتے ہوئے چودھری شرف دین یہ فیصلہ بھی سنا گیا کہ موج دین کو وہ تین ایکڑ رقبہ اگلی فصل سے خالی کرنا ہو گا جو اس نے موج دین کو ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ چودھری کے بیٹے سُلی سے جھگڑا کر کے آنے والے چھوٹے کاشتکار کے بیٹے ماہنے کی گھر آمد اور چودھری کی دھمکی آمیز گفتگو ملاحظہ ہو:

> "موج دینا! تو اپنے لڑکے کی حمایت کر رہا ہے۔ نہیں چوہدری ۔۔۔ میں اس سے پوچھوں گا۔ جو اس کا قصور نکلے گا تو میں اسے سزادوں گا۔ پوچھے بنا میں اسے قصوروار کیسے ٹھہراؤں۔۔۔ چوہدری بیٹھ تو جاؤ۔۔۔ نہیں۔۔۔ نالے کے کنارے جو میرے تین کھیت ہیں۔ وہ۔۔ چوہدری رک گیا۔ میں نے اُن کا پورا پورا ٹھیکا دے دیا ہے چوہدری!۔۔ ان کھیتوں پر میں خود کاشت کروں گا۔"(۳)

قیام پاکستان کے وقت جہاں کئی دیگر مشکلات و مسائل نے جنم لیا وہاں یہ مسئلہ بھی پیش آیا کہ یہاں دکانداری کا کام ہندو کرتے تھے۔ جب وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہندوستان چلے گئے تو لوگوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ دیہاتی جو جنس کے بدلے دکاندار سے ضروریات زندگی کا سامان خرید لیتے تھے انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی معاملہ چک مراد کے رہنے والوں کے ساتھ بھی ہوا۔ برج لال کھتری کے چلے جانے کے بعد انہیں اشیائے صرف کی خریداری کے لیے دوسرے گاؤں میں جانا پڑتا تھا۔ دوسری جانب جیسے ہر طاقت ور اور بااثر

آدمی نے ہندوؤں کی جائداد پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کو سر چھپانے کی جگہ میسر نہ رہی، چودھری شرف دین کی بھی خواہش تھی کہ وہ برج لال کی حویلی اور دکان پر قابض ہو جائے اس لیے اس نے حویلی اور دکان کو تالے لگوا کے چابی اپنے قبضے میں کر لی، گاؤں والوں کو ڈراتا ڈھمکاتا رہتا کہ اگر کسی نے اس پر قابض ہونے کی کوشش کی تو حکومت سخت سزا دے گی۔ گاؤں والوں کی پریشانی دکان بند ہونے کی وجہ سے بڑھتی جا رہی تھی:

> "برج لال کھتری کے چلے جانے کے بعد ہم گاؤں والے عرصے سے دکان سے محروم تھے۔ میں کوئی بہت دور کی بات نہیں کرتا لیکن اس زمانے میں بھی کسانوں کے ہاتھ میں پیسہ کم ہی آتا تھا۔ ہم اکثر جنس کے بدلے سودا لیا کرتے تھے۔ برج لال کے ہاں سے ہمیں چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرنی پڑتی تھیں۔ لون تیل، سوئی سلائی، سجی صابن اور اس قسم کی دوسری چیزیں ہمیں جنس کے بدلے اس کی دکان سے مل جاتی تھیں۔ اب دکان کے نہ ہونے سے ہمیں تکلیف تھی۔ ہمیں ان کے لیے دوسرے دیہات میں جانا پڑتا تھا۔ چوہدری نے برج لال کی دکان اور مکان پر تالا لگا رکھا تھا۔ برج لال کی دکان اور مکان پکے تھے اور چوہدری کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ یہ اس کے قبضے سے نکل جائیں۔ (۴)

شہروں میں جہاں روزگار کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ وہاں تعلیم اور صحت کے حوالے سے بھی قدرے بہتر سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ بچوں کو پڑھائی کا مناسب ماحول میسر آتا ہے۔ چھٹی کے بعد جو والدین بچوں کو گھر میں پڑھانے کے لیے وقت نہ دے سکیں انھیں شام کے وقت بچوں کو پڑھانے والے ادارے اور اساتذہ میسر ہوتے ہیں جو ان کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے کمی دور کرتے ہیں جب کہ دیہاتوں میں رہنے والے بچوں کو میلوں سفر کر کے حصول تعلیم کے لیے جانا پڑتا ہے اور پھر گھر واپس آ کر بھی انھیں سکول کا کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ دیہی علاقوں میں پڑھنے والے غریب بچوں کی سکول سے واپسی پر اولین ذمہ داری والدین کی کھیتی باڑی کے کاموں میں مدد اور مال مویشیوں کے لیے چارہ لانے میں ہاتھ بٹانا ہوتا ہے۔ ان تمام ذمہ داریوں سے فارغ ہونے کے بعد دیہی ماحول میں پرورش پانے والے بچے سکول کے کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ بعض بچے اس سخت کوش ماحول میں بھی اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر اساتذہ کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں اور محنتی اور مستحق بچوں کی فیس وغیرہ معاف کر دی جاتی ہے۔ ناول نگار نے کمال فن کاری سے دیہی زندگی کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے جہاں تعلیم

کے حصول میں طرح طرح کی مشکلات ہیں۔ غریبوں کے لیے کتابوں کا حصول تک ممکن نہیں ہوتا اور کتنے بچے صرف اس وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر پاتے کہ ان کے والدین ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے:

> "اس دوپہر کو میں درختوں کے سمٹے ہوئے سایوں کے ساتھ لگ لگ کر گھر پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے ایک مدت کے بعد میں پھر گاؤں کی گلیوں کا محرم بنا ہوں۔ روٹی کھا کر میں ذری بھر کو دکان پر گیا۔ بھا اسلم میرے ہاتھ میں بستہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ میں اس کے پاس چند لمحوں کے لیے رکا اور کنویں کی طرف چل پڑا۔ اس دوپہر کنویں پر سایہ کرنے والے درختوں کی چھاؤں میں تھکے ہوئے مسافر کی طرح بیٹھا ہی تھا کہ دوپہر گزر گئی اور سفر کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ میں نے چار اوار ابنایا تو میرے باپ نے کہا اب سکول کا کام کر لو۔ میں نے شام کا اندھیرا چھا جانے سے پہلے پہلے کام ختم کر لیا اور بستہ بغل میں داب کر گاؤں کا رخ کر لیا۔"(۵)

اسلم جو ایک مہاجر تھا اور سب کچھ لٹا کر چک مراد پہنچا تو پہلی رات اُسے موج دین کے گھر پناہ ملی۔ اس کی پتا سن کر نہ صرف اسے اس گھر کے فرد کی حیثیت حاصل ہو گئی بل کہ اس کی شادی بھی موج دین کی بیٹی سے ہو گئی اور مہاجر ہونے کے ناطے اسے برج موہن کھتری کی حویلی اور دکان بھی الاٹ ہو گئی۔ جب تالے کھولے گئے تو بھرے گھر میں سب کچھ غائب تھا جو چودھری نے کمال صفائی سے اٹھوا لیا تھا۔ اسلم کی دکانداری چلنے لگی۔ اہل دیہہ کا مسئلہ حل ہو گیا کہ انھیں خریداری کے لیے دوسرے گاؤں نہ جانا پڑتا تھا۔ چودھری شرف دین نے ٹیوب ویل لگوا لیا اور لوگوں کو جب جی چاہتا پانی دیتا اور جس وقت چاہتا پانی سے جواب دے دیتا۔ موج دین، رحمت خاں اور کچھ دوسرے لوگوں نے دکاندار چودھری اسلم کے ساتھ مل کر ٹیوب لگوانے کا منصوبہ بنایا ہی تھا کہ اسلم پر اسمگلنگ کا سامان فروخت کرنے کے جرم میں پرچہ ہو گیا۔ ناول نگار نے بہت خوب صورت طریقے سے ان نمبرداروں اور سفید پوشوں کے رویوں کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ کس طرح غریبوں اور کمزوروں کو مقدموں میں پھنسا کر انتقام کا نشانہ بناتے ہیں۔ پولیس کے ساتھ ساز باز کر کے بے گناہوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کروانے والے یہ نام نہاد لوگوں کے ہمدرد نہیں چاہتے کہ کسی غریب کو بھی کچھ کھانے کو مل جائے۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ پولیس کس طرح ان ٹاؤٹوں کے ساتھ مل کر سیدھے سادے بے چارے دیہاتیوں کا استحصال کرتی ہے۔ چور کو دودھ کا دھلا

بنا دینا اور شریف آدمی کو مجرم ثابت کر دینا پولیس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ،بس مال لگنے کی بات ہے۔ ایسا ہی چودھری اسلم کے ساتھ ہوا کہ ایک صبح پولیس والے گاؤں پہنچے اور اسلم کی دکان کو گھیرے میں لے لیا۔لوگ اکٹھے ہوئے تو پولیس والوں نے بتایا کہ اسلم پر الزام ہے کہ یہ اسمگلنگ کا سامان فروخت کرتا ہے۔ اتنے میں چودھری شرف دین آگیا، تھانیدار کو یہ کہہ کر کہ پولیس نمبر دار کو بلایا کرتی تھی آپ نے مجھے نہیں بلایا یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اسے کسی بات کا پتہ تک نہیں اور اسے پولیس کی یہ کار روائی اچھی نہیں لگی۔ جب اہل دیہہ اور نمبر دار کی موجودگی میں سپاہی نے تالے کو ہاتھ لگایا تو وہ فوراً کھل گیا جیسے پہلے ہی کھلا ہو۔ اس پر ماہنے کو اصل بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگی:

> "میرے من میں شک کا اکھوا پھوٹا تو میں نے چوہدری کی طرف دیکھا۔ چوہدری اپنے خیال میں گم تھا لیکن ایک اڑتی ہوئی مسکراہٹ کو اس نے دانتوں میں بھینچ لیا تھا، پر اپنے چہرے پر وہ اس چور مسکراہٹ کی چمک چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ ایک گھناؤنی چمک جیسے ایک مدت کے بعد اس کے دل میں کوئی شیطانی خواہش پوری ہو رہی ہو۔ انتقام میں کتنی شیطانی لذت ہے۔ میں نے سوچا۔ تب غصے اور نفرت کی ایک لہر اٹھی اور یکایک میرا سینہ کرودھ کے زہر سے بھر گیا۔ میرے منہ کا مزہ کڑوا ہو گیا۔۔۔ تھانیدار نے کہا، چوہدری! اپنے دو تین معتبر آدمیوں سے کہو، وہ میرے ساتھ دکان میں داخل ہوں۔ میں مال برآمد کروں گا تو وہ عینی گواہ ہوں گے۔ اللہ داد ٹارچ جلاؤ۔ جب گواہ کا لفظ لوگوں نے سنا تو وہ ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ تھانیدار نے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔ خبردار جو کوئی یہاں سے گیا۔ میں سب کے سامنے مال برآمد کروں گا۔ اس وقت چوہدری نے بظاہر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ موج دین کہاں ہے۔ وہ کنویں پر ہو گا۔ کسی نے جواب دیا۔ اس کا یہاں موجود ہونا ضروری تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا تو۔۔۔ تو تیرے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی۔ ایک نسوانی آواز آئی۔ سب نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے مڑے بغیر اسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ تھانیدار نے کہا بڑھیا تو یہاں کیوں آئی ہے؟۔۔۔ میں وہ بات کہنے آئی ہوں جو کسی اور کی زبان پہ نہ آتی تھانیدارا۔ جا چلی جا ریشماں! تیرا مردوں میں کیا کام؟ چوہدری نے کہا۔۔

تھانیدارا! اس کی باتوں میں نہ آنا۔ تو قانون کا رکھوالا بن کر آیا ہے نا۔ انصاف سے کام لینا۔"(۶)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں انصاف کا حصول ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ تمام برائیوں کی جڑ بھی انصاف کی عدم فراہمی ہے تو غلط نہیں۔ ہمارے عدالتی نظام میں پیچیدگیوں کے سبب کئی بے گناہوں کو پھانسی چڑھا دیا جاتا ہے اور مجرم دندناتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ غریبوں، مزدوروں، مزارعوں اور ہاریوں کے لیے گھر بھی جیل ہیں اور امیر لوگوں کو جیل میں بھی گھر جیسی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ ہمارے سیاست دان، افسران، سفید پوش اور چودھری عدالتوں اور عدالتی فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ غریب کے گھر کے برتن بھی بک جاتے ہیں اور اسے انصاف نہیں ملتا۔ یہ ہمارے معاشرے کے لیے ایک ناسور سے کم نہیں اور ناول نگار نے اس حقیقت کو آشکارا کرنے میں کسی کوتاہی یا مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا۔ جس طرح عبدالرحمن عرف مانے اور رحمت خاں نے چودھری اسلم کے کیس کی پیروی کی اور اس کو ضمانت پر رہائی دلائی وہ بھی آسان کام نہ تھا مگر جب کیس مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچا تو جنھیں اسلم کی بے گناہی کا یقین تھا اور گواہوں کی گواہی اور وکلا کے بحث کے بعد اس کی رہائی کی امید لگائے بیٹھے تھے حیران رہ گئے:

"اس کے بعد مقدمہ چلا۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ہمارے وکیل نے کھلے تالے کے نکتے پر خوب بحث کی۔ اس بحث کے بعد مجھے یقین ہو چلا تھا کہ بھا اسلم باعزت طور پر بری ہو جائے گا۔ چوہدری کے آدمی جرح میں نہ ٹھہر سکے تھے۔ صفائی کے گواہوں کے بیان میں سرکاری وکیل کوئی رکھنا نہ ڈال سکا تھا۔ میں نے سوچا سچ کی عمارت کو جھوٹ کے ہاتھ ہلا تو سکتے ہیں لیکن ڈھا نہیں سکتے۔۔۔ لیکن جب مجسٹریٹ نے فیصلہ سنایا تو سچ کی عمارت دھڑام سے گر پڑی اور جھوٹ جیت گیا۔ میں سُن ہو کر رہ گیا جیسے طوفان کے ایک جھونکے نے میرے یقین کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا ہو۔ کوئی چیز بنیاد سے اکھڑ جائے تو پھر اسے کون سنبھالا دے سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا کوئی غم نہیں تھا کہ بھا اسلم کو ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور تین ماہ کی قید کی سزا ہو گئی ہے۔ غم تو اس بات کا تھا کہ میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔ اب یہ جڑ نہیں سکتی اور اس وقت دنیا کی

حقیقت میری نگاہوں کے سامنے بدل گئی جیسے اس میں کوئی سورج نہ ہو، کوئی چاند نہ ہو، بس گھُپ اندھیرا ہو۔ میں نے سوچا جھوٹ کتنی بڑی حقیقت ہے۔"(۷)

اقتدار کا حصول ہی ہمارے سیاست دانوں، نوابوں، سفید پوشوں کی زندگی کا مقصد ہے۔ بڑے زمیندار قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبر بننا اپنا موروثی حق سمجھتے ہیں تو چھوٹے زمیندار، نمبر دار اور سفید پوش کونسل کی سطح پر ممبر بننا اپنے عزت و وقار کی علامت سمجھتے ہیں۔ ہمارا سیاسی نظام اس طرح کا ہے کہ کسی غریب کا سیاست میں حصہ لینا ممکن ہیں نہیں اور کوئی ستایا ہوا مظلوم، غریب ہمت کر کے مقابلے پر آجائے تو اس کو میدان سے باہر کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں۔ پچھلے الیکشن میں چودھری شرف دین رحمت خاں کے مقابلے میں ہار گیا تھا اور جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چودھری کو اس بات کا غرور اور تکبر تھا کہ لوگ اس کی دولت سے مرعوب ہو کر اور اس کے کیمپ سے کھانا کھا کر اسے کامیاب کروائیں گے مگر لوگوں نے کھانا چودھری کے کیمپ سے کھایا، پرچیاں اس کے کیمپ سے لیں مگر ووٹ ڈالتے وقت انھوں نے رحمت خاں کو ووٹ ڈالا۔ اس الیکشن میں چودھری شرف دین کا بیٹا سلیمان عرف سلی جو تعلیم مکمل کرنے کے بعد وکالت کرنے لگا تھا، میدان میں اترا۔ مقابلے میں دوسرے دھڑے نے عبدالرحمن عرف ماہنا کو میدان میں اتارنے کا فیصلہ کیا۔ چودھری شرف دین بڑا کایاں آدمی تھا اور وہ اپنی پچھلی ہار بھولا نہیں تھا اس لیے اُس نے اپنے بیٹے سلیمان عرف سُلی کو کامیاب کروانے کے لیے ہر طریقہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔ ناول میں یہ بات بڑے واضح طریقے سے بتائی گئی ہے کہ جب مطلب ہو تو یہ لوگ غریبوں کو اپنے بھائی اور ہمدرد بنا لیتے ہیں اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں حد درجہ کی چاپلوسی کرتے ہیں ایسا ہی چودھری شرف دین کر رہا تھا:

"اس انتخاب میں چوہدری نے فیصلہ کیا کہ وہ سلیمان کو جتانے کے لیے ہر ہتھیار استعمال کرے گا۔۔۔ اسے اپنی شکست یاد تھی۔ اُسے یہ بھی ڈر تھا کہ سلیمان کی شکست سے اس کی وکالت پر برا اثر پڑے گا، اس لیے وہ میرے باپ کے پاس آیا۔۔۔ اس نے اپنے پرانے تعلقات کا واسطہ دیا۔ اپنی زیادتیوں پر شرمساری کا اظہار کیا۔ یہ بھی کہا کہ سلی اور ماہنے میں مقابلہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کہو تو میں سلیمان کو بٹھا دوں۔۔۔۔ میرے باپ کا دل پسیج گیا۔۔۔ میں نے کہا میں ایک شرط پر مقابلے سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ کون سی شرط؟۔۔۔ سلی یہ وعدہ کرے کہ وہ پکی

سڑک سے گاؤں تک آنے والے رستے کو پکا کروادے گا۔ چوہدری کے کان میں اس کی بھنک پڑی تو وہ ہٹی پر آموجود ہوا۔ اُس نے آدمی بھیج کر چوہدری رحمت خان اور بابا حیات کو خاص طور پر بلوایا۔ کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہوئے اور اس نے سب کی موجودگی میں کہا میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ چوہدریو! سلیمان ممبر بن گیا تو اس ایک میل کو پکا کروانا کچھ مشکل نہیں۔ میں سب سے پہلا کام یہی کروں گا۔ سرکار سے کوئی مدد نہ ملی تو میں اپنی گرہ سے یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔"(۸)

ناول نگار نے ہمارے ان عوامی خدمت گاروں اور سیاسی نمائندوں کے حوالے سے واضح کیا ہے کہ الیکشن کے دنوں میں یہ غریبوں سے گھل مل جاتے ہیں اور ان کی ہر طرح کی کڑوی کسیلی باتیں خوش دلی سے سنتے ہیں مگر کامیابی کے بعد کسی کو منھ نہیں لگاتے۔ الیکشن سے قبل لوگوں کی قسمت بدلنے کے بلند و بانگ دعوے بھی ہمارے سیاسی کلچر کا حصہ ہیں اور بے شمار ترقیاتی کاموں کے وعدے بھی عام بات ہے مگر کامیابی کے بعد یہی نمائندے ملتے ہی نہیں ہیں اور اگر کبھی ملاقات ہو بھی جائے تو جلد وعدہ کی تکمیل کی یقین دہانی کے ساتھ جان چھڑوا لیتے ہیں۔ الیکشن سے قبل چودھری شرف دین نے بھی گاؤں والوں سے سڑک کی تعمیر کا وعدہ کیا تھا مگر کامیابی کے بعد وہ بھول ہی گیا:

"چوہدری رحمت خان نے سڑک کے بارے میں اسے اپنا وعدہ یاد دلایا تو اس نے کہا اتنی بے صبری بھی کیا؟ تم لوگ تو ہتھیلی پر سرسوں اگانا چاہتے ہو۔ ابھی سرکار کو ان چھوٹے چھوٹے کاموں کی فرصت کہاں۔ ابھی سلیمان کو صدارتی انتخاب کے لیے بہت کام کرنا ہے۔ اس کے بعد دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔"(۹)

جب چودھری شرف دین نے بابا حیات کو سڑک بنانے کے حوالے سے جلی کٹی سنائیں تو اس کے بعد انھیں شاید احساس ہو گیا کہ چوہدری کی زبان پر اعتبار کر کے انھوں نے غلطی کی ہے اور پھر اس کے بعد گاؤں کے کچھ نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کر کے سڑک پر کام شروع کر دیا۔ عبدالرحمن عرف ماہنا جس بھٹے پر منشی تھا، وہاں سے اس نے رعائتی قیمت پر اینٹیں لے کر دیں۔ گاؤں کے مستری سے کچھ جوانوں نے سڑک پر اینٹیں جمانے کا طریقہ سیکھ لیا اور اس مستری کی نگرانی میں اینٹیں لگانے لگے چند دنوں میں بڑی سڑک سے گاؤں تک اینٹوں کی ایک سرخ سرخ قطار نظر آرہی تھی اور سڑک تیار ہو چکی تھی مگر جب سڑک تیار ہو گئی تو جس طرح چودھری کے بیٹے سلیمان نے علاقے کے ممبر اسمبلی کے ہمراہ اس سڑک کا افتتاح کرنے کا منصوبہ بنایا اس سے اس حکمران طبقے کی ذہنیت کا پتا

چلتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سڑک کی تکمیل پر چودھری شرف دین وعدہ خلافی پر معافی مانگتا مگر اس کی بجائے اس نے کمال ڈھٹائی سے سڑک کے افتتاح کا پروگرام بنا کر لوگوں کو اکٹھا کیا اور ممبر اسمبلی کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ سب کام اس کی نگرانی میں ہوا ہے اور اس کا محرک بھی وہی ہے۔ گاؤں میں ممبر اسمبلی کو جو وکیل بھی تھا بلایا گیا اور اس کے گلے میں ہار ڈال کر خصوصی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔

دیہاتوں میں رہنے والے چھوٹے کاشتکار اور مزارعے ہمیشہ سے بڑے زمینداروں کے جبر کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ ان بے چاروں کی نہ عزتیں محفوظ ہیں اور نہ گھر۔ دیہاتوں میں غریب اور امیر کے لیے۔ نمبر دار اور مزارعے کے لیے، سفید پوش اور چھوٹے کاشتکار کے لیے الگ الگ قانون ہیں۔ یہاں پنچایتیں بیٹھ کر فیصلے بھی کرتی ہیں اور مجرموں کو سزائیں بھی سنائی جاتی ہیں مگر صرف غریبوں کو۔ اگر کوئی کمزور جرم کرتا ہے تو اسے گاؤں بدر کرنے کی سزا بھی سنائی جا سکتی ہے، مگر یہی جرم نمبر دار یا اس کا بیٹا کرے تو اس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ ناول نگار نے چودھری شرف دین کے روپ میں اس دیس کے تمام زمینداروں اور جاگیرداروں کے دہرے معیار انصاف کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ پڑھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اجلے لباس پہنے اونچے شملے والے یہ لوگ اندر سے کتنے میلے ہوتے ہیں۔ جب چودھری شرف دین کی سربراہی میں پنچایت نے شیماں کو گاؤں سے نکل جانے کا حکم سنایا تو ماسی ریشو نے سب کا کچا چھٹا کھول دیا:

> اونچے طرے والے ان کے ساتھ اپنے لاڈلے سُلی کو بھی گاؤں سے نکال دے۔ پتا ہے جب سیداں گاؤں سے غائب رہی تھی تو وہ کہاں اور کس کے پاس گئی تھی؟ لوگو! یہ عورت چپ نہ ہوئی تو میں پنچایت سے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ چوہدری نے چیخ کر کہا۔ جا اٹھ کر چلا جا۔ تو کون سا چہرہ لے کر بھری پنچایت میں بیٹھا ہے؟ اب میں اس کی باتیں سن نہیں سکتا لوگو! اس کا منہ بند کرو۔ سچی بات کڑوی ہوتی ہے نا! تو بھلا کیسے سن سکے گا؟ لوگو! ذرا اس اُجلے کپڑوں والے سے پوچھو تو، اس نے کس کا گناہ مستری کی جھولی میں ڈال کر اسے گاؤں سے نکالا تھا۔ چوہدری کا چہرہ جو ایک پل پہلے غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا، یکایک کورے کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا۔ تب کاغذیوں تڑمڑ ہو گیا جیسے کسی نے اسے مُٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ وہ چارپائی پر سے اٹھا پھر بیٹھ گیا جیسے اس کی ٹانگوں میں کھڑا ہونے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔ اس نے رک رک کر کہا۔ اس ڈائن کو

پنچایت سے نکال دو۔ بابا حیات بولا! ریشم! تو جانتی ہے، تو نے چوہدری پر کتنا بڑا الزام لگایا ہے؟ ہاں میں جانتی ہوں۔ ماسی نے آنکھوں میں آگ بھر کر کہا۔ جو یہ بات سچی نہ نکلی تو تیری سزا؟ وہی جو کالے چور کی ہوتی ہے۔ میرا منہ کالا کر کے گدے پر سوار کرنا اور مجھے گلی گلی پھرانا۔ کسی سے کہو دینے اور جھنڈو کو پنچایت میں لے آئے۔ ان کے سر پر قرآن رکھ کر پوچھنا۔"(۱۰)

ناول میرا گاؤں میں غلام الثقلین نقوی نے دیہی زندگی کو مختلف زاویوں سے اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نے گاؤں میں رہنے والے لوگوں کی خوشی، غمی، دوستی اور دشمنی کے ساتھ ساتھ حکومتی کارندوں اور جاگیر دار طبقے کے ہاتھوں ہونے والے استحصال کا ذکر کر کے غریب دیہاتیوں کے مسائل و مشکلات کو بیان کیا ہے۔ ناول میں ملک کے سیاسی حالات کا ذکر بھی ملتا ہے اور ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی داستان بھی بیان کی گئی ہے۔

غلام الثقلین نقوی کے ناول گاؤں کو تکنیکی لحاظ سے دیکھیں تو یہ بیانیہ تکنیک کا ناول ہے جس میں فلیش بیک کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ ناول نگار نے تمام کرداروں کو بہت خوب صورت اور جاندار طریقے سے پیش کیا اور بلاشبہ اس لحاظ سے بھی اس ناول کو اہمیت حاصل ہے کہ یہ دیہی پس منظر میں لکھے جانے والے ان گنتی کے چند ناولوں میں ہے جہاں غریبوں، مزارعوں اور چھوٹے کاشتکاروں کے مسائل، مشکلات کو بیان کیا گیا ہے۔ جاگیرداروں اور چودھریوں کے دہرے رویوں کو بھی عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ سیاسی شعور اور ملکی حالات کے حوالے سے عوام کی دلچسپیوں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح ہر حکومت کے بدلنے پر بچارے غریب اپنی قسمت بدلنے کی امید لگا لیتے ہیں مگر ان کی قسمت بدلنے والا ستارہ طلوع ہی نہیں ہوتا۔ غریبوں کا یہ ترجمان صرف چک مراد کی بات نہیں کرتا بل کہ یہ ہمارے ملک کے ہر گاؤں کی کہانی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

"نقوی صاحب نے اس ناول کے کرداروں کے نقوش کچھ اس طرح ابھارے ہیں کہ یہ گاؤں پورے پاکستان کے دیہاتوں اور ان میں بسنے والے کسانوں کا نمائندہ بن گیا ہے۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے واقعات دلوں اور دماغوں میں جزرو مد پیدا کرتے ہیں تو ایک ایسی کہانی مرتب ہوتی چلی جاتی ہے جو ہمارے معاشرے میں بارہا آتی رہی لیکن

نظر انداز ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ہم چک مراد کو پاکستان کے کسی بھی گاؤں کی علامت قرار دے سکتے ہیں۔"(۱۱)

غلام الثقلین نقوی نے دیہی زندگی کے مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان سیاسی مداریوں کے کالے کرتوتوں کا بھی ذکر کیا ہے جو انھوں نے اونچے طروں کے نیچے چھپائے ہوئے ہیں اور الیکشن کے وقت سبز باغ دکھانے والے جیتنے کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے آدمی کی کوشش سے معاشرے میں کچھ مسائل کم ہو جائیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ فیتہ وہ کاٹیں، افتتاح وہ کریں اور نیک نامی ان کے حصے میں آئے۔ خود نمائی کے اسیر اور شہرت کے پجاری یہ لوگ جو ہمارے نام نہاد لیڈران کے نام سے ملک کی عوام پر مسلط ہو چکے ہیں، عملی طور پر لوگوں کی مشکلات کم کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ معروف نقاد ڈاکٹر افضال بٹ کے خیالات ناول میرا گاؤں کے حوالے سے کچھ یوں ہیں:

"غلام الثقلین نقوی ایک محب وطن حساس فنکار ہیں۔ وہ دیہی سوجھ بوجھ کے پس منظر میں پاکستانی سیاست کے عدم استحکام کی اچھی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کا ناول دیہی سماج کی اقتصادی ناہمواری اور طبقاتی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے جس دلگداز حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے وہ یہ ہے کہ ملک میں جیسی بھی سیاسی تبدیلی آئے غریب عوام اور کسان کی حالت بدستور پہلے جیسی ہی رہتی ہے۔ اپنے ملک کے جمہوری سیاسی ڈھانچے سے مصنف ہی نہیں بل کہ ہر باشعور اور حقیقت پسند بدظن نظر آتا ہے۔"(۱۲)

دیہی زندگی میں پیار، محبت اور خلوص کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ لوگ خوشی، غمی کے موقع پر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایک کا دکھ سب کا دکھ اور ایک کی پریشانی سب کی پریشانی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برعکس شہروں میں نفسا نفسی کا عالم اور خود غرضی پر مشتمل ماحول ہوتا ہے۔ پڑوس والے گھر میں بسنے والوں سے بھی راہ چلتے سلام دعا ہو جائے تو بڑی بات ہے ورنہ کسی کے پاس دوسرے کے لیے وقت نہیں۔ ہر شخص اپنے مسائل میں گھرا بال بچوں کی روزی روٹی کی فکر میں ہوتا ہے۔ شہری زندگی بناوٹ، مصنوعی پن اور دکھاوے کی عکاس ہے تو دیہی زندگی سادگی اور حقیقت پسندی کا بہترین نمونہ ہے۔ ناول نگار نے ناول میرا گاؤں میں دیہی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کا بڑے شاندار انداز میں احاطہ کیا ہے اور غریب دیہاتیوں کے مسائل اور ان کا استحصال کرنے والی

قوتوں کی ایک سچی اور سُچی تصویر پیش کر کے اس ناول کو اردو کے چند معروف ناولوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ ناول کی تنقید کے حوالے سے معروف نام ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی رائے اس ناول کے حوالے سے یہ ہے:

"۱۹۸۲ء میں غلام الثقلین نقوی کا ناول 'میرا گاؤں' سامنے آتا ہے۔ یہ ایک ایسا دیہی معاشرت کی عکاسی کرنے والا ناول ہے جو راقم الحروف کے مطابق زندگی کے جمال و جلال کی پیش کش کرتا ہے۔ اس گاؤں کا جمال، پیار، محبت، خلوص، رواداری، قربانی، دوستی، کرم نوازی اور ہمدردی کا ماحول ہے اس کے برعکس اس معاشرے میں جاگیر دارانہ زندگی سے پھوٹا ہوا جلال استحصال، تکبر، نفرت، تعصبات، گروہ بندی اور شر پسندیوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ناول کا خاتمہ مثبت اور تعمیری ہے۔" (۱۳)

ناول میرا گاؤں کے حوالے سے پروفیسر غلام غوث چیمہ نے کہا ہے:

"پاکستان میں دیہی کلچر دو واضح حصوں میں منقسم ہے۔ جو اپنے اپنے مخصوص معاشی ڈھانچوں کے زیر اثر نمو پزیر ہو کر پروان چڑھے ہیں۔" (۱۴)

یقیناً ایک حصہ غریب کاشتکار ہیں اور دوسرا ان کا استحصال کرنے والے جاگیر دار۔ ناول نگار نے ان دونوں طبقوں کی مختلف کرداروں کے ذریعے شاندار عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر انور سدید، شاہد شیدائی، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر سمیت کئی نقادوں نے "میرا گاؤں" کو اردو کے ان چند ناولوں میں سے ایک قرار دیا ہے جو دیہی معاشرت کے عکاس ہیں۔ "ایک گاؤں کی کہانی" کے نام سے ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون اس حوالے سے سند کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"غلام الثقلین نقوی نے پہلی بار پنجاب کے گاؤں کو اس کی واقعی صورت میں اردو ادب میں منتقل کیا ہے تو بہت سے ایسے الفاظ جو پہلے اردو ادب کے لیے غیر مانوس تھے ایک نئی مانوسیت کے ساتھ ابھر کر اردو زبان کا حصہ بن گئے۔ اس قسم کے الفاظ جیسے پولا، سلا، سیہاڑ، چک پھیریاں، سیپی، ماہل، ڈھاری، پہل چھلا، بنوں، سرلاٹا اور چوکڑہ وغیرہ۔ غالباً پہلی بار تجربے کے لمس سے آشنا ہو کر اردو ادب میں شامل ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں غلام الثقلین نقوی نے پنجاب کے دیہات کی اصل فضا اس کی مٹی کی باس، دھوپ کی چمکاٹ، برکھا کی ٹھنڈی نمی اور خوشیوں کی لہلہاہٹ کو اس خوب صورتی سے

گرفت میں لیا ہے کہ پورا گاؤں اردو ادب میں ایک اکھوے کی طرح نمودار ہو گیا ہے۔
مجھے یقین ہے کہ اس ناول کی آمد کے بعد اردو ادب کی جڑیں یہاں کی دھرتی میں پوری
طرح اترتی چلی جائیں گی۔"(۱۵)

ناول "میرا گاؤں" دیہی معاشرت کے عکاس ان چند ناولوں میں سے ایک ہے جنھیں اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ناول نگار نے بہت عمدہ انداز سے مشینوں کے دیہی زندگی پر اثرات کے ساتھ ساتھ مزارعین اور چھوٹے کاشتکاروں پر چودھریوں، نمبرداروں اور سفید پوشوں کے مظالم کی تصویر کشی کی ہے۔ دیہی کلچر میں پنچایتی نظام اور سیاسی نظام کے حوالے سے بھی بتایا گیا ہے کہ گاؤں کے سرکردہ اور چودھریوں کے اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے اور قانوں ہیں جبکہ غریب اور بے سہارالوگوں کے لیے الگ قانون۔ عدالتی نظام کے حوالے سے بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح یہاں انصاف بکتا ہے اور غریب بے گناہ مجرم ثابت ہو جاتے ہیں اور بااثر افراد کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ناول نگار نے پولیس کو ملنے والے اختیارات اوران اختیارات کے ناجائز استعمال کے حوالے سے بھی واضح کیا ہے کہ کس طرح ملزمان سے برآمدگیاں کی جاتی ہیں اور کس طرح لوگوں سے رشوت لی جاتی ہے۔ پٹواری کلچر کس طرح ان غریب اور کمزور لوگوں کے استحصال کا سبب بن رہا ہے۔ ناول نگار نے دیہی کلچر میں پروان چڑھنے والے رواجوں کے حوالے سے بھی خوب عکاسی کی ہے۔ ختم ہونے والی رسموں اور ان کی جگہ لینے والی رسموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مشینی زندگی نے کس طرح دیہات میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ افرادی قوت کے متبادل جب مشینری نے جگہ لے لی تو دیہاتیوں نے شہروں کا رخ کر کے ملوں فیکٹریوں میں کام شروع کر دیا۔ ناول میں نشے جیسی لعنت اور اس کے بعد کے اثرات کے حوالے سے بھی مناظر ملتے ہیں اور غربت و جہالت کے ہاتھوں بے بس عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ناول میں منظر نگاری، جذبات نگاری اور سلاست روانی جیسی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ ناول نگار نے تمام کرداروں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

ناول "میرا گاؤں" فنی اور فکری لحاظ سے اردو کے چند بہترین ناولوں میں سے ایک اور دیہی زندگی کا عکاس عمدہ ناول ہے۔ جسے اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ بلا شبہ قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے اردو ناولوں میں اس ناول کو خاص مقام حاصل ہے جو غلام الثقلین نقوی کی بہترین کاوش ہے جسے ناقدین نے اعلیٰ پائے کا ناول قرار دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ غلام الثقلین نقوی، میرا گاؤں، ابلاغ پبلشرز لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۴ء، ص:۳۴

۲۔ ایضاً، ص:۶۸

۳۔ ایضاً، ص:۷۲

۴۔ ایضاً، ص:۸۱

۵۔ ایضاً، ص:۱۳۰

۶۔ ایضاً، ص:۲۱۷

۷۔ ایضاً، ص:۲۲۱

۸۔ ایضاً، ص:۹۱۔۲۹۰

۹۔ ایضاً، ص:۲۹۲

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۱۵

۱۱۔ انور سدید، اردو ناول کے رنگ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص:۱۲۸

۱۲۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور (طبع دوم)، پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۱۵ء، ص:۲۶۰

۱۳۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص:۱۶۳

۱۴۔ پروفیسر غلام غوث چیمہ، مضمون مشمولہ "میرا گاؤں" محولہ بالا، ص:۳۴۵

۱۵۔ وزیر آغا، ایک گاؤں کی کہانی، دیباچہ، میرا گاؤں، محولہ بالا، ص:۱۶